بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

انسانی تاریخ ترکِ وطن کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ بڑے بڑے انسانی گروہوں کو صدیوں کے قومی مسکن چھوڑنے پڑے ہیں۔ خصوصاً جنگِ عظیم دوم کے بعد کے قریبی زمانے میں تو آبادیوں کے اِدھر سے اُدھر منتقل ہونے یا برسوں کیمپوں میں رہنے کے واقعات اتنے زیادہ ہیں کہ موجودہ تہذیب پر سے یکسر اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔ جمہوریت، رواداری اور مساوات اور حقِ اختلاف اور حقِ خود ارادیت کے حق میں سنہرے فلسفوں کا تانا بانا تاریخ کے آسمان پر قوسِ قزح کی طرح دکھائی دیتا ہے اور آدمی مسحور ہو کر پکار اُٹھتا ہے کہ یہ عظیم دورِ ترقی ہے اور انسان ذہنی اور سماجی لحاظ سے بہت بلند ہو چکا ہے، مگر اس دورِ تہذیب کی اصطلاحات اور سلوگنوں کے سکّے تجربے کی کسوٹی پر یکسر کھوٹے نکلتے ہیں۔ ہر جھوٹ پر سچائی کا لیبل لگا دیا گیا ہے اور ہر بُرائی کی پیکنگ ترقی کے اطلسی پارچات سے کی گئی ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ہم دروغ پر دروغ کے طلسم خانے میں جی رہے ہیں۔

جس درجے اور جن جن طریقوں سے انسان پر اس دور میں تشدّد ہو رہا ہے، جو پُر فریب چالیں بڑی قوم چھوٹی قوموں کے خلاف چل رہی ہے، یا بہت سے علاقوں میں وحشی اکثریتیں جس طرح اقلیتوں کو چیر پھاڑ رہی ہیں، اور خاص طور سے مسلمانوں کے خلاف گہری سازشوں اور مصنوعی پروپیگنڈے کی شکل میں مختلف اطراف سے جو صلیبی جنگ لڑی جا رہی ہے، ان حقائق کو سمجھنے کے بعد انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ سرے سے آج کی تہذیب قرونِ مظلمہ کی وحشت کا نیا روپ تو نہیں اور قوت کی اعلیٰ مسندوں پر بیٹھنے والے اکابر انسانوں کے روپ میں درندے تو نہیں۔

وہ درندگی جس نے ویت نام کے لاکھوں انسانوں کو دیس سے اکھاڑ دیا۔ جس نے کمپوچیا کی آبادی کو ہلا دیا، جس نے صومالیہ کی سرحد پر لاکھوں انسانوں کو بچوں سمیت پانی تک کے لیے سسکنے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ درندگی جو آسام سے لاکھوں مسلمانوں کو نکالنے کے لیے طوفان اُٹھائے ہوئے ہے اور کل جس نے بنگلہ دیش سے ہزارہا افراد کو برما، نیپال اور دوسرے اطراف میں پناہ ڈھونڈنے کے لیے پریشان حال بنا دیا، انسانیت کی پستی کی کیسی بڑی مثالیں ہیں۔

تازہ مثال افغانستان کے مہاجرین کی ہے جو تقریباً ۱۵، ۱۶ لاکھ کی تعداد میں گھروں سے اُجڑ کر ملک سے باہر آگئے ہیں[۱]۔

اسلامی مقاصد کے لیے جان بازی کرنے والی قوم کے ایسے لوگ جو زخمی ہو گئے یا جن کے گھر بلکہ گاؤں کے گاؤں اُجاڑ دیے گئے ہیں، یا جن عورتوں اور بچوں کے سرپرست ختم ہو گئے ہیں، یا جن لوگوں کو خواتین کی عزّت خطرے میں دیکھ کر وطن چھوڑنا پڑا ہے، اُن کی مجبورانہ ہجرت ایک دینی عمل ہے اور اس وجہ سے ان کا آنا ہمارے لیے بھی باعثِ خیر و برکت ہے۔ اُن کو اپنے ہاں پناہ دینا باعثِ ثواب ہے۔

دوسری طرف ۱۳ لاکھ مہاجرین کا ہمارے ہاں طویل عرصے کے لیے مہمان بن کے رہنا ایک امتحان و آزمائش ہے۔ ہمارے اسلامی جذبۂ اخوت کے لیے خدا نے ہمیں ان کا انصار بنایا ہے تو اس کے ہاں حساب بھی ہونا ہے کہ ہم نے انصار ہونے کا حق کس حد تک ادا کیا۔

۱؎ اصطلاحاً ہر وہ ترکِ وطن ہجرت کہلاتا ہے جو خدا اور اس کے دین کے لیے ہو، دیگر اسباب سے تبدیلِ وطن کو ہجرت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ خدا اور دین کی محبت کے بجائے کسی مفاد کے لیے نکلنے والوں کو تارکینِ وطن اور کسی مصیبت یا ظلم و جور کی وجہ سے گھر بار چھوڑنے والوں کو پناہ گزین کہا جاتا ہے۔ افغانستان کے لوگ ایک مخالفِ اسلام نظریے کے تسلط کے خلاف جہاد آرا ہیں اور اس معرکہ آرائی کی وجہ سے وہ جب ناقابلِ حل آلام و مصائب سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ سرحد پار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اُن کا وطن چھوڑنا ہجرت کی تعریف میں آتا ہے۔

اس امتحان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تاریخِ انسانی کی وہ عظیم و روشن مثال سامنے لائیے جب کہ مدینے کے مسلمانوں پر سینکڑوں مہاجرین کو سنبھالنے کی ذمہ داری آپڑی تھی اور اس ذمہ داری کو انہوں نے اس فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے ادا کیا کہ اپنے اموال و املاک میں سے نصف نصف اُن کے حوالے کر دیا۔ ہم مسلمان ہیں تو اس قسم کا موقع جب بھی تاریخ میں پیدا ہو، ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم مدینے کی روشن مثال کا احیا کر کے دُنیا کے سامنے اسلام کی عظمت اور رشتۂ اخوتِ اسلامی کے تقدس کو تاباں کر دکھائیں۔

اہلِ پاکستان میں ایک بڑی تعداد ایسی ہے جسے ۱۹۴۷ء میں بھارت سے خون کے سمندر عبور کر کے پاکستان میں پناہ لینی پڑی تھی، ایک تعداد ایسی بھی ہے جو ۱۹۷۱ء کے سانحہ کے بعد بنگلہ دیش سے نکل کر پہلے دوسرے علاقوں میں اور پھر پاکستان میں پہنچی، اور اب بھی بہاریوں کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ پاکستان کے اندر سیلابوں کی تباہ کاریوں کا نشانہ بن کر سرکاری اور عوامی امدادی کارروائیوں پر مہینوں کیمپوں میں گذر کرنے والے بھی مہاجرین کے مسائل کو سمجھ سکتے ہیں۔

جو لوگ اس آزمائش سے گذر چکے ہیں، اُن کو اندازہ ہوگا کہ لُٹ پُٹ کر وطن سے نکلنا کیا کیا مسائل اپنے ساتھ رکھتا ہے اور اُس وقت قدم قدم پر ہر شخص دوسرے انسانوں کی محبت و حمایت اور اُن کے احسان و تعاون کا ضرورت مند ہوتا ہے۔ پھر دو چار دس دن کہیں رہنا ہو تو محض برائے نام غذا پر لوگ جنگلوں اور غاروں میں بھی وقت گذار لیتے ہیں۔ لیکن جب لمبے عرصہ کے لیے کسی جگہ قیام ضروری ہو جائے تو پھر اہم درجے کی ضروریات بھی بہت ساری ہوتی ہیں۔ سر چھپانے کا انتظام، ایندھن اور روشنی کا انتظام، بستروں، کپڑوں اور برتنوں کا انتظام، بچوں کے لیے دُودھ کا انتظام، بیماروں کے لیے دوا دارو کا انتظام، پانی کا انتظام وغیرہ، یہ ضروریات بہت وسیع دائرہ رکھتی ہیں اور ان کے لیے موجودہ حالات میں بڑی مالی مدد چاہیے۔ اور ہماری ذمہ داری ہے کہ دنیا کے دوسرے لوگ مدد بھیجیں یا نہ بھیجیں، ہم اپنے مہاجر مہمانوں کو عزت و آبرو کے ساتھ تمام ضروریات فراہم کریں۔
کل جب وہ واپس جائیں تو اہلِ پاکستان کی محبت و اخوت کی قدر کا جذبہ لے کے جائیں۔ اس کی برکت سے آئندہ افغانستان کے عوام ہمیشہ پاکستان کے خیر خواہ رہیں گے۔ اور جو مخالف قوتیں

ان میں پاکستان کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرتی رہی ہیں وہ کامیاب نہ ہو سکیں گی۔ لیکن اگر ہم نے کوتاہی کی اور ہماری بدسلوکی یا کم توجہی کی شکایات کا زہر ہمارے مہاجر مہمانوں کے دلوں میں رہ گیا تو وہ ہماری حسِ اسلامیت کا مرثیہ بن جائیں گے۔ ہماری آج کی غفلتیں افغانستان کے عوام کو ہمیشہ کے لیے ہم سے دُور کر دیں گی۔

ذرا سوچیے کہ کل خدانخواستہ اگر کوئی ایسا موقع آجاتا ہے کہ پاکستان کے شہریوں کو افغانستان میں پناہ لینی پڑ جائے تو آج مہاجرین کے ساتھ کی ہوئی بدسلوکی یا بے توجہی کیا نتائج دے گی۔[1]

مَیں خاص طور پر اپنے اُن صاحبِ حیثیت بھائیوں سے اپیل کرنا چاہتا ہوں جو روپیہ کمانے میں، روپے سے کھیلنے میں اور روپے کو آگ لگانے میں گم ہیں۔ جن کے دسترخوان پر بہار، جن کی تقریبیں پُرشکوہ، جن کے لباس فاخرہ، جن کے مشغلے جائز و ناجائز تفریحات و تعیشات ہیں۔ وہ جو لذات کے لیے حرام کمائیوں میں محو ہیں، جو معیارِ زندگی بڑھانے کے لیے افراد اور قوم دونوں سے خیانت کرتے ہیں۔ بھائیو! تمہارے گھر کے آنگن میں خود انسانی زندگی لبسمل ہے، اس کے لیے معیارِ زندگی اور تعیشاتِ زندگی کا کیا سوال رہ جاتا ہے۔ تمہارے گھر میں اس تحریکِ جہاد کے مہاجرین وارد ہیں جو اپنی جنگ کے علاوہ تمہاری جنگ لڑ رہی ہے۔ افغانستان والے اگر رُوسی جارحیت کے آگے اپنے آپ کو دیوار بنا کے کھڑا نہ کر دیتے تو آج جنگ کا دیو خود تمہارے گھر میں خونی رقص کر رہا ہوتا۔ افغانستان کے مجاہدین اور مہاجرین ہمارے محسن ہیں، ہمارا مقام یہ نہیں کہ ہم اُن پر رحم کھانے والے بنیں، بلکہ ہمیں تو اُن کے احسان کے اعتراف کے طور پر اُن کی خدمت کرنی چاہیے۔

مگر کیا مجال کہ افغانستان کی تحریکِ جہاد یا کثیر التعداد مہاجرین افغانستان کے ورود کے بعد ہماری عادات و اطوار میں ذرا بھی فرق پڑا ہو، مشاغل میں کوئی بھی کوئی بھی تبدیلی آئی ہو یا سوچ بچار کے ڈھانچے بدلے ہوں، ہر کوئی اپنی اپنی دلچسپیوں میں گم ہے۔

---

[1] یاد رہے کہ کچھ مدت پہلے جب یہاں کے لوگ ترکِ وطن کر کے افغانستان میں گئے تھے تو وہاں کے افغان بھائیوں نے اُن کو عزت و احترام سے رکھا تھا اور اُن کی خدمت کی تھی۔ پڑوسی ملکوں میں دونوں طرف سے ایسے مواقع کئی بار آ سکتے ہیں۔

مہاجرین کی سب سے پہلی ضرورت سچی اخوت اور مخلصانہ ہمدردی کی ہے۔

مگر میں اپنے ماحول کے لوگوں کو دیکھ کر یہ کہتا ہوں کہ ہمارا یہ حال ہے کہ جیسے سرے سے مہاجرین کا موضوع ہی ہمارے ذہنوں سے خارج ہے۔ کتنے لوگ اس معاملے میں غور کرتے ہیں؟ کتنے مہاجرین کے احوال و ضروریات کو جاننے کی فکر کرتے ہیں؟ کتنے باہم دگر ملتے ہوئے اُن کی تکالیف پر گفتگو میں کرتے ہیں؟

پاکستان جیسے ملک میں تیرہ لاکھ مہاجروں کا پناہ گزین ہونا ایک بڑا واقعہ ہے۔ مگر اتنے بڑے واقعہ کی طرف ہماری توجہات منعطف نہیں ہوتیں۔

اُلٹا کبھی کبھار بعض روس پرست اور کارمل نواز عناصر کو افغان مہاجرین کے خلاف چہ میگوئیاں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان ظالموں میں ایک ایسے تخریب پسند اور انسانیت ناآشنا لوگ پائے جاتے ہیں جن کا بس چلے تو وہ مہاجرین پر حملہ آور ہو کر روس کے ہاتھ مضبوط کریں۔ ان عناصر کے ساتھ اپوزیشن کا ایک تلخ مزاج محاذ بھی شامل ہے جو موجودہ حکومت کے خلاف اپنے جذباتِ عناد کو ہر اس مسئلے میں استعمال کرنا چاہتا ہے جس کی حمایت حکومت کرے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ ایسی عاقبت نااندیشانہ حرکات کا نتیجہ کیا نکلے گا۔

یہ تو اللہ کا فضل ہے کہ نہ تو روس نواز کمیونسٹوں کو اور نہ اپوزیشن کے بے اصول اور تلخ مزاج دھڑے کو پاکستان کی محب اسلام اکثریت کے مقابلے میں ایسی جرأت ہو سکی کہ وہ مہاجرین کے معاملے میں کوئی ٹیڑھی حرکت کریں۔ اور آئندہ بھی خدا کی مشیت ان کے شر میں مانع رہے گی۔

پس ہر سچے مسلمان اور پاکستانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ مہاجرین افغانستان سے محبت کرے، ان کی عزت کرے اور ان کو اہمیت دے۔ نیز انہیں اپنی بھرپور اخلاقی تائید بہم پہنچا کر ہر قسم کے مخالفانہ پروپیگنڈے کا توڑ کرے۔

دوسری ضرورت خوراک، لباس، رہائشی سامان اور علاج معالجہ کے انتظام کی ہے۔

اس مسئلے سے عمومی تغافل کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لوگ یہ خیال کر کے مطمئن ہوں کہ حکومت سب کچھ کر رہی ہے۔ بلاشبہ حکومت نے اپنی قوم کی طرف سے بڑی بھاری ذمہ داری اٹھا

رکھی ہے، مگر کوئی بھی حکومت عوام کے بھرپور تعاون کے بغیر بھاری ذمہ داریوں سے عہدہ برا نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی درست ہے کہ کچھ نہ کچھ لوگ مہاجرین کے لئے انفاق کرتے بھی ہیں۔ بعض وہ جو تصویر و تشہیر کے ساتھ، اور بعض وہ جو خاموشی سے محض حصولِ رضائے الٰہی کے لیے۔ مگر اب تک جو کچھ جس رفتار سے ہوا ہے وہ کافی نہیں ہے۔

پھر مہاجرین کے متعلق وہی ٹیڑھے مزاج کے لوگ یہ بات پھیلاتے رہتے ہیں کہ اجی مہاجرین کا کیا ہے، وہ تو ٹرک اور گاڑیاں لے کر آئے ہیں اور وہ تو یہاں آکر کاروبار کر رہے ہیں۔ ان کو کسی کی مدد کی کیا ضرورت! یہ فقرہ سنتے ہی ہر آدمی کے متحرک جذبات بالکل ساکن ہو جاتے ہیں اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ مہاجرین کا کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔

۱۳ لاکھ مہاجرین کے ساتھ ۱۳ لاکھ گاڑیاں تو نہیں آگئیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ مہاجرین کے قافلے جب گھروں سے نکل کے آئے ہیں تو جس کے بس میں تھا اس نے گاڑی بھی ساتھ لے لی۔ ایسے لوگ کتنے ہوں گے؟ ۱۳ لاکھ تو کیا ۱۳ سو بھی نہیں ہوں گے۔ تھوڑے سے افراد کو اگر ایسا موقع مل بھی گیا تھا تو یہ اچھی بات ہوئی کہ وہ ایک قیمتی مشینری پاکستان میں لے آئے۔ اور یہ بھی بری بات نہیں کہ کوئی شخص اگر ٹرک یہاں لے آیا ہے تو اسے کھڑا رکھنے کے بجائے وہ چلاتا ہے اور اس سے کچھ آمدنی ہوتی ہے۔ مگر ایک ٹرک کی آمدنی سے پانچ دس ہزار افراد کی گزر بسر تو نہیں ہو سکتی۔ اس طرح اگر چند مہاجرین خوانچہ لگا لیتے ہیں یا کہیں مزدوری کر لیتے ہیں تو اس سے بھی ۱۳ لاکھ افراد (جن میں عورتوں، بچوں، بوڑھوں، زخمیوں اور معذوروں کی مجموعی تعداد زیادہ ہے) کی معاش تو پوری نہیں ہو جاتی۔

اس سے پہلے پاکستان نے ایسے بھی مہاجرین دیکھے ہیں جن کے مرد، عورتیں اور بچے مسجدوں کے سامنے، سٹیشنوں اور بسوں کے اڈوں اور بازاروں میں مانگتے پھرتے تھے۔ آفرین ہے افغان مہاجرین پر کہ ان کی غیرت نے ان کو گداگری کی اجازت نہیں دی۔ اگر ان کے چند افراد اپنی ضروریات کے لئے کوئی کام کاج یا محنت کر لیتے ہیں تو اس سے ہزار درجے بہتر ہے کہ وہ جا بجا مانگتے نظر آتے۔ اس لحاظ سے یہ مہاجرین دنیا بھر کے لئے ایک اچھا نمونہ اور ہمارے لئے قابل فخر ہیں۔

یہ پروپیگنڈہ بھی کیا جاتا ہے کہ مہاجرین کمبل، دوسری اشیاء کو بیچ لیتے ہیں۔ ایسی حالت میں امداد

دینے کا کیا حاصل؟ اصل صورت یہ ہے کہ جس مہاجر کو ۵، ۶ سو روپے والا ولایتی کمبل ملتا ہے، وہ اس قیمتی کمبل کو بیچ کر چالیس پچاس روپے کا پرانا کمبل حاصل کر لیتا ہے اور بقیہ رقم سے وہ اپنی دوسری بہت سی ضروریات پوری کرتا ہے جو امدادی رقم اور سامان سے پوری نہیں ہوتیں۔ اسی طرح اگر مہاجرین ولایتی بسکٹوں یا پنیر کے ڈبوں کو بیچ کر دال سبزی لے لیں تو اس کے معنی یہ کیسے ہوئے کہ وہ لوگ امدادی سامان کو یونہی اڑا دیتے ہیں۔

ایک تیسری غلط فہمی اور بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ باہر سے آنے والی امدادی رقوم اور خود ملک کے اندر سے دیے جانے والے عطیات کا اخبارات اور ریڈیو میں جب اعلان ہوتا ہے تو عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ امداد تو مل رہی ہے اب اور آخر کیا چاہیے۔ مثلاً آپ نے سنا کہ ۲ لاکھ ڈالر آئے ہیں یعنی ۲۰۶ لاکھ روپے۔

اب ذرا تقسیم کر کے دیکھیے، یہ ہوا تقریباً ڈیڑھ روپیہ فی کس۔ کیا خیال ہے آپ کا ڈیڑھ روپیہ فی کس لے کر کوئی بھی گھر وقت گزاری کر سکتا ہے۔ محض کھانے کا سامان بھی پورا کر سکتا ہے؟ پھر مسئلہ ایک دن کا نہیں، زیادہ وقت کا ہے۔

آپ یوں حساب لگائیں کہ اگر مہاجرین پر فی کس ایک روپیہ کا خرچ یومیہ محسوب کیا جائے تو پورا سال گزارنے کے لیے ۷۴ کروڑ ۵۴ لاکھ روپے کی ضرورت ہو گی۔ لیکن ایک روپیہ فی کس میں ضروریات پوری کرنا ناممکن ہے۔ رہنے سہنے اور کھانے پینے سے لے کر علاج معالجہ تک کی ساری ضروریات کو سامنے رکھ کر اگر آپ پانچ روپے فی کس کے مصارف کا ادنیٰ ترین تخمینہ لگائیں تو مطلوبہ رقم ڈیڑھ ارب ۲۷ کروڑ ۵۳ لاکھ روپے ہو گی۔

بس اسی پر تکیہ کر لینا کہ فلاں ملک سے اتنے لاکھ یا کروڑ سکے آ گئے، یا صدر صاحب کے فنڈ میں چند کروڑ روپے جمع ہو گئے ہیں۔ زندگی کے حقائق سے تغافل کی صورت ہی میں ممکن ہے۔

سارے عطیات اور اعانتوں کے باوجود اصل بھاری ذمہ داری باشندگانِ پاکستان کے سر ہی عاید ہوتی ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ عطیات اور چندوں کی رقوم کی تو اخبارات اور ریڈیو سے پبلسٹی (باقی بر صفحہ ۴۵)